بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟

آپ کسی سے بات کیجیے اور زندگی کے کسی شعبے سے متعلق کیجئے، حاصل گفتگو یہ ہوگا کہ ہمارے ہاں لوگوں میں کیریکٹر نہیں رہا۔ گھر کے افراد میں کیریکٹر نہیں۔ پڑوسیوں میں کیریکٹر نہیں۔ اہل محلّہ میں کیریکٹر نہیں۔ کاروباری دنیا میں کیریکٹر نہیں۔ دفاتر میں، عدالتوں میں، ایوان حکومت میں، ارباب نظم ونسق میں، غرضیکہ کہیں بھی کیریکٹر نہیں ملتا۔ آپ کسی خرابی کا تجزیہ کریں۔ کسی شکایت کے بنیادی سبب کا سراغ لگائیں، آخرالامر آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ سب کیریکٹر کے فقدان کی وجہ سے ہے۔ قوم کے زوال کا باعث ہے تو یہی مرض اور پاکستان کی تباہی کا موجب ہے تو یہی علت۔ یہ روگ، قوم اور ملک کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھائے جارہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے قصر حیات کا ہر ستون کھوکھلا ہو چکا ہے اور ہر قلب حساس اس خطرے سے متوحش ہے کہ کہیں ذرا سا بھی دھچکا لگا تو یہ عمارت چھت سمیت نیچے آ گرے گی۔

کیریکٹر کے متعلق ہم گفتگو تو اسی شرح وبسط اور تکرار واصرار سے کرتے ہیں، لیکن اگر کسی سے پوچھا جائے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں تو شاید سو میں سے ایک آدھ بمشکل بتا سکے کہ اس کا متعین مفہوم کیا ہے۔ جو کچھ عام طور پر کہا جائے گا وہ یہی ہوگا کہ جب تک کسی کو رشوت نہ دی جائے کوئی کام نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ لوگوں کو یہ بھی کہتے سنیں گے کہ صاحب! اس موجودہ افسر سے تو وہی افسر اچھا تھا جو دس روپے لے کر کام کر دیتا تھا۔ اس کے ہاتھوں تو دنیا تنگ آ چکی ہے۔ جس کی فائل اس کے سامنے ہو اس کے متعلق یہ پہلے پتہ کرتا ہے کہ اس نے سابقہ الیکشن میں ووٹ کسے دیا تھا۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جس مقام پر کسی کے کام میں کوئی رکاوٹ پڑے یا اسے کوئی نقصان ہو تو وہ کہہ دے گا کہ لوگوں میں کیریکٹر نہیں رہا۔ لیکن ظاہر ہے کہ کیریکٹر کی یہ

تعریف (Definition) تو بے معنی ہے؟ لہٰذا سوال یہ ہے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں؟

کیریکٹر کی تعریف

علمی نقطۂ نگاہ سے اس سوال کا تعلق اخلاقیات (Ethics) سے ہے۔ لیکن علمائے اخلاقیات بھی جس انداز سے کیریکٹر کی تعریف (Definition) بیان کرتے ہیں اس سے عام لوگوں کے لیے بات صاف نہیں ہوتی۔ مثلاً (Soren Kierkligarrd) کے نزدیک:

اخلاق، کیریکٹر کا نام ہے اور کیریکٹر وہ ہے جو انسان کی ذات کے اندر منقوش ہے۔ کیریکٹر درحقیقت داخلیت کا نام ہے۔ بداخلاقی بھی توانائی کی حیثیت سے کیریکٹر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص نہ تو اچھے اخلاق کا مالک ہے اور نہ ہی برے کا تو وہ انسان نہیں حیوان ہے۔

(The present Age)

پروفیسر وہائٹ ہیڈ کے نزدیک کریکٹر، صداقت (Truth) کے مظاہرہ کا نام ہے اور جب ظاہر (Appearance) حقیقت (Reality) کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو اسے صداقت کہتے ہیں۔ (Adventure of Ideas)

مارٹن بوبر کہتا ہے کہ کیریکٹر درحقیقت خیر (Good) اختیار کرنے کا نام ہے۔ خیر کے معنی ہیں ایسا سفر جس میں ہر قدم منزل مقصود کی طرف اٹھے اور شر کے معنی ہیں انسانی ممکنات کا بگولے کا سا رقص۔ (Between Man and Man)

باردیو کے نزدیک ''اپنے آپ پر قابو رکھنے کا نام کیریکٹر ہے۔'' اس کی تائید (Alexandar Loveday) بھی کرتا ہے۔ (Teinter) کا قول ہے کہ:

انسانی ماحول کے متعلق انسان کا وہ رویہ جو مستقل ہو اور اس کا مظاہرہ اس کے اعمال سے ہوتا رہے، کیریکٹر کہلاتا ہے۔

(The Concept and Education of Character)

آپ نے دیکھا کہ کیریکٹر کی ان (Definitions) سے بات صاف نہیں ہوتی۔ آیئے ذرا عام فہم الفاظ میں دیکھیں کہ کیریکٹر کا مفہوم کیا ہے؟

مال صدقۂ جان

ہمارے ہاں ایک عام محاورہ ہے۔۔۔مال صدقۂ جان، جان صدقۂ آبرو۔۔۔اس محاورہ کا پہلا حصہ بالکل واضح ہے۔یعنی مال بھی اپنی قیمت رکھتا ہے۔یہ ایسی چیز ہے جسے انسان کو حاصل کرنا اور سنبھال کر رکھنا چاہیے۔لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ مال اور جان میں سے ایک ہی چیز باقی رہ سکتی ہو تو اس وقت جان کی حفاظت کے لیے مال کی پروا نہیں کرنی چاہئے۔لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے۔۔۔یعنی جان کی حفاظت کے لیے مال قربان کر دیتا ہے۔۔۔تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ اس کا کیریکٹر بڑا بلند ہے۔نہ ہی اس شخص کے متعلق جو جان دے دیتا ہے لیکن پیسہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت پست تھا۔آپ نے اس بینے کا قصہ سنا ہوگا جو سخت بیمار ہو گیا اور اس کا بیٹا سول سرجن کو بلا لایا۔۔۔اس لیے نہیں کہ اس کے علاج سے اس کے باپ کو شفاء ہو جائے گی بلکہ اس لیے کہ برادری والے یہ نہ کہیں کہ اس نے باپ کا اچھی طرح علاج نہیں کرایا۔۔۔سول سرجن نے مریض کو دیکھا۔مرض کی تشخیص کی۔پھر نسخہ لکھا جس میں مختلف قسم کی قیمتی دوائیں تجویز کیں۔ڈاکٹر رخصت ہوا تو بیٹا نسخہ لے کر بازار کو چلا۔باپ نے آواز دی اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ بازار سے دوائیاں خریدنے جا رہا ہوں تا کہ علاج شروع کیا جائے۔باپ نے کہا کہ یونہی بلا پوچھے گچھے نہ خرید لینا۔پہلے پنڈت جی کے پاس جانا اور معلوم کرنا کہ کریا کرم (تجہیز و تکفین) پر کیا خرچ ہوگا اور پھر دوائیوں کی قیمت دریافت کرنا۔دونوں میں جو سستا ہو اسے اختیار کرنا۔

آپ کو بنئے کی اس بات پر بے اختیار ہنسی آجائے گی لیکن آپ اس کے متعلق یہ نہیں کہیں گے کہ اس کا کیریکٹر پست تھا۔آپ یہی کہیں گے کہ وہ بڑا بیوقوف تھا۔جان کی حفاظت (Preservation of Self) ایک جذبہ ہے جو ہر ذی حیات میں جبلی طور پر (By Instinct) پایا جاتا ہے۔چیونٹی کو دیکھیے۔ننھی سی جان ہے لیکن اگر کوئی اس کے راستہ میں ذرا سی رکاوٹ بھی ڈالے جس سے اسے خطرہ محسوس ہو تو وہ اپنی حفاظت کے لیے کس قدر ہاتھ پاؤں مارتی ہے؟ یہ جذبہ تمام حیوانات میں پایا جاتا ہے۔یہ حیوانی سطح زندگی کے ایک جبلی جذبہ کا

مظاہرہ ہے جو انسان اس کے خلاف کرتا ہے اسے عقل و ہوش سے عاری سمجھا جاتا ہے۔۔۔جو شخص اپنے آپ کو نقصان پہنچائے اسے پاگل کہتے ہیں۔

جان صدقہ آبرو

اب اس محاورے کے دوسرے حصے کو لیجیے۔یعنی ''جان صدقہ آبرو'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جان بھی اپنی قیمت رکھتی ہے اور اس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔لیکن اگر ایسا وقت آجائے کہ جان اور آبرو میں (Tie) پڑ جائے۔جب ان دونوں میں صرف ایک کو بچایا جا سکے تو پھر انسان کو چاہیے کہ جان دے دے لیکن آبرو پر آنچ نہ آنے دے۔جو شخص آبرو کو بچانے کے لیے جان دے دیتا ہے۔ساری دنیا اس کے متعلق کہتی ہے کہ اس نے بلند کیریکٹر کا ثبوت دیا ہے۔اس کے برعکس جو شخص آبرو کو ہاتھ سے جانے دے اور اپنی جان بچالے اسے انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔اس کے متعلق ہر شخص کہتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت پست ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔جان بچانے کا جذبہ ہر انسان میں جبلی طور پر پایا جاتا ہے۔اس لیے جو شخص (مثلاً مال کی قربانی سے) جان بچالیتا ہے اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ اس کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔اس کے برعکس آبرو کا تعلق حیوانی دنیا سے نہیں۔حیوانات، آبرو کے تصور سے آشنا تک نہیں ہوتے۔

کیریکٹر کی تعریف

یہ صرف انسانی خصوصیت ہے۔اس کا تعلق شرف انسانیت سے ہے۔اس لیے جو شخص جان دے کر شرف انسانیت کو بچالیتا ہے۔اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔آبرو انسانی قدر (Human Value) ہے۔اس قسم کی اور اقدار بھی ہیں، جن کا تعلق انسانیت سے ہے۔ان اقدار کا تحفظ زندگی کو حیوانی سطح سے بلند کر کے انسانی سطح پر لے جاتا ہے۔

لہٰذا بات یوں ہوئی کہ جو شخص کسی انسانی قدر کی حفاظت کے لیے اپنے طبعی تقاضے کو قربان کر دیتا ہے اسے کیریکٹر والا انسان کہتے ہیں۔آئندہ سطور میں اسی اجمال کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ آبرو کے تحفظ کے لیے جان دے دینے والا، صاحب کردار کہلاتا ہے۔ آبرو ایک جامع لفظ ہے جس کا اطلاق انسانیت کے مختلف گوشوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ خدا نے میری آبرو رکھ لی تو اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھے اپنے ہم عصروں میں شرمندہ نہیں ہونا پڑا۔ لیکن آبرو کا ایک مفہوم ایسا ہے جو بہت نمایاں ہے۔ اس کا تعلق عفت وعصمت سے ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ اس لڑکی نے اپنی آبرو بچانے کے لیے جان تک دے دی تو اس سے عفت وعصمت ہی مقصود ہوتی ہے۔ آبرو کے اس مفہوم کو سامنے رکھئے اور پھر ان مثالوں پر غور کیجئے جو ابھی بیان کی جاتی ہیں۔

آبرو کا معیار

ہمارے ہاں اگر کوئی بد باطن، کسی شریف زادی کے برقعے کی طرف بھی بری نگاہ سے دیکھے تو اس لڑکی کا باپ یا بھائی اس شخص کو گولی مار دے گا۔ خود اس کے لیے اسے پھانسی کے تختے پر بھی کیوں نہ چڑھنا پڑے۔۔۔ لیکن یورپ میں کوئی لڑکی اپنے آپ کو کسی نوجوان کی آغوش میں بھی کیوں نہ دے دے اس کے باپ یا بھائی کی پیشانی پر شکن تک نہیں پڑے گی۔ بلکہ وہ خوش ہوں گے کہ ان کی لڑکی (یا بہن) سوسائٹی میں بڑی ہر دلعزیز (Popular) ہو رہی ہے۔ اس نے اپنا (Boy Friend) تلاش کر لیا ہے۔ اس سے ایک اہم سوال ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ جو شخص کسی انسانی قدر (Human Value) کی حفاظت کرتا ہے اسے کیریکٹر کا مالک قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن جو مثال ابھی ابھی ہمارے سامنے آئی ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ''انسانی اقدار'' ہر معاشرہ (Society) کی اپنی اپنی ہیں۔

مختلف اقدار ہیں

ایک قدر جو ہمارے معاشرہ میں اس قدر اہمیت رکھتی ہے، دوسرے معاشرہ میں اسے قدر سمجھا ہی نہیں جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مختلف معاشروں میں کیریکٹر کا معیار مختلف ہوگا اور ہم کسی چیز کو انسانی کیریکٹر یا عالمگیر کیریکٹر قرار نہیں دے سکیں گے۔ ہم ماں باپ کی اس قدر عزت اور تعظیم کرتے ہیں۔ لیکن ایسے قبائل بھی گزرے ہیں جو ماں باپ کو کھا جانا ایک مقدس فریضہ سمجھتے

تھے۔مقدس(Puritans) حبشی بچوں کو چرا کر لے جانے اور آئرستان کے باشندوں کو گولی مار دینے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں ایک دوسرے سے سود لینا معیوب بلکہ جرم تھا لیکن غیر یہود سے سود لینے کی عام اجازت تھی۔ بحرالکاہل کے قریب ایک قبیلہ ہے جس کے نزدیک بددیانتی پسندیدہ ترین اخلاق سمجھی جاتی ہے جو شخص جس قدر کامیابی سے دھوکا دے سکتا ہو اسے اسی قدر عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ٹھگوں کے ہاں وہ نوجوان سب سے زیادہ قابل فخر سمجھا جاتا ہے جو مظلوم راہرو کو پرفریب طریق پر قتل کر ڈالے۔

نیشنلزم آج ساری دنیا کا مسلمہ انداز سیاست واجتماعیت ہے۔ اس مسلک کی رو سے جو شخص دوسری قوموں کو لوٹ کھسوٹ کر اپنی قوم کی مرفہ الحالی کا سامان بہم پہنچائے اسے سب سے بڑا محب وطن سمجھا جاتا ہے۔ اس کے مجسّمے نصب ہوتے ہیں اور اس کا شمار بلند ترین انسانوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا عقیدہ (Rumelin) کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کے تحفظ اور اپنی قوت کی نشوونما ہے۔ اسے کسی دوسری مملکت کے مفاد کا خیال صرف اسی صورت میں رکھنا چاہئے جب اس سے اس کے اپنے مفاد پر زد نہ پڑتی ہو۔ مملکت کا استحکام ہر اخلاقی تقاضے پر مقدم ہے اور اس کے لیے ہر قربانی جائز۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ:

1۔ کیریکٹر نام ہے انسانی اقدار کے تحفظ کا۔۔۔لیکن

2۔ یہ اقدار ہر معاشرہ میں مختلف ہیں، حتیٰ کہ نیشنلزم کے مسلک کی رو سے اپنی قوم کے مفاد کا تحفظ بلند ترین قدر ہے۔ خواہ اس کے لیے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔

لہٰذا اس تصور کی رو سے دنیا میں نہ کوئی عالمگیر مستقل اقدار ہیں اور نہ ہی کیریکٹر کا کوئی عالمگیر مستقل معیار۔ کیریکٹر کے معنی ہوں گے ان اقدار سے ہم آہنگ رہنا جنہیں کوئی معاشرہ کسی وقت اپنے ہاں مستحسن قرار دے لے۔ سپارٹا میں چوری کرنا مستحسن خیال کیا جاتا تھا۔ اس لیے وہاں سب سے بڑا چور سب سے بلند کیریکٹر کا انسان تصور ہوتا تھا۔ آج چوری کرنا جرم ہے اس لیے چور بدترین کیریکٹر کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کسی کنواری لڑکی کا حاملہ ہو جانا

سارے خاندان کی رسوائی کا موجب قرار پاجاتا ہے لیکن یورپ میں کسی بالغ جوڑے کا باہمی رضامندی سے اختلاط نہ عیب سمجھا جاتا ہے نہ جرم۔ حتیٰ کہ اب وہاں تراضی مابین سے لواطت کو بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی وہاں قانوناً اجازت ہے۔

قرآنی نقطۂ نگاہ

یہ ایک نقطہ نگاہ ہے۔ یعنی جب کسی بات کو کوئی معاشرہ معیوب قرار دے تو اس کا ارتکاب قابل نفرت اور مستوجب سزا ہوتا ہے۔ جسے وہ ایسا تصور نہ کرے، اس کا ارتکاب نہ بے عزتی کا باعث سمجھا جاتا ہے نہ موجب عقوبت۔ لیکن قرآن کا نقطۂ نگاہ دوسرا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مختلف ممالک میں بسنے والے انسانوں کا طرز معاشرت اور انداز بود و باش مختلف ہوسکتا ہے۔ لیکن ان کی اقدار مختلف نہیں ہوسکتیں۔ انسانی اقدار ہر جگہ ایک ہی ہونی چاہیں اور ایسی ہونی چاہیں جن میں کوئی ردوبدل نہ کرسکے۔ یہ اقدار عقل انسانی وضع نہیں کرسکتی۔ یہ وحی کے ذریعے ملتی ہیں۔ آج یہ اقدار قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں جو تمام نوع انسان کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ضابطہ ہدایت ہے۔ انہیں مستقل اقدار (Permanent Values) کہا جاتا ہے۔ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام کیریکٹر ہے۔ قرآن اسے ''تقویٰ'' کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ مغرب کے مشہور عالم اخلاقیات راشڈل (Hastings Rashdal) کے الفاظ ہیں:

اخلاقیات سے مفہوم ہی یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لیے ایک مطلق معیار ہے۔ جو ہر انسان کے لیے یکساں ہے[1]

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے یہ اقدار عقل انسانی کی وضع کردہ نہیں ہوسکتیں۔ یہ وحی کے ذریعہ ملتی ہیں۔ اس باب میں راشڈل کہتا ہے:

اس قسم کا اخلاقی قانون کسی انسانی شعور سے نہیں مل سکتا۔ انسان اخلاقی مسائل کے متعلق الگ الگ نگاہ رکھتا ہے اور اس امر کی ہمارے پاس کوئی خارجی دلیل نہیں کہ دنیا کے تمام انسان

[1] The Theory of Good and Evil, Vol. II, P311

اخلاقیات میں کبھی ایک ہی نگاہ رکھیں گے۔[1]

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ان اقدار کا تعلق انسان کی انسانی سطح زندگی (Human Level of Life) سے ہے۔ حیوانی سطح سے نہیں۔ حیوانی سطح زندگی کو طبعی زندگی (Physical Life) کہہ لیجیے۔ قرآن اسے ''حیوٰۃ الدنیا'' کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ جس سے مراد ہے ایسی زندگی جس میں انسان کی نگاہ قریبی یا پیش پاافتادہ مفاد پر ہی رہے۔ (لفظ دنیا کے معنی ''قریب تر'' کے ہیں) انسان کو اپنے حیوانی تقاضوں کی تسکین میں بڑی لذت ملتی ہے۔ اگرچہ یہ لذت بڑی سطحی ہوتی ہے) قرآن کی رو سے ان لذات کا حصول بڑی چیز نہیں وہ انہیں وجہ جاذبیت قرار دیتا ہے۔ لیکن اصل سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں اس سطح زندگی کے کسی تقاضے اور ''انسانی قدر'' میں (Tie) پڑتی ہے۔ اس وقت اگر کوئی شخص اس تقاضے کو ترجیح دے کر انسانی قدر کو قربان کر دیتا ہے تو وہ بلندیٔ کردار کا ثبوت نہیں دیتا۔ لیکن اگر وہ انسان قدر کے تحفظ کو حیوانی تقاضے پر ترجیح دیتا ہے تو اسے کیریکٹر کہا جائے گا۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے۔

اسے کیریکٹر کہیں گے

''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ'' اے ایمان والو! تم عدل و انصاف کی پوری پوری حفاظت کرو۔ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ اگر تمہیں کسی معاملہ میں گواہی دینی پڑے تو اپنے اور بیگانے سب کے خیال سے بلند ہو کر صرف اللہ کے لیے شہادت ہو۔ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ۚ خواہ یہ شہادت خود تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف۔ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ اس کا بھی خیال نہ کرو کہ جس کے حق میں تمہاری شہادت جا رہی ہے وہ امیر ہے یا غریب۔ قانون خداوندی، امیر اور غریب دونوں کا سب سے زیادہ محافظ ہے۔ لہٰذا خدا کا حق سب پر فائق ہے۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ دیکھو! کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اپنے مفاد، رشتہ داری کے تقاضے یا دولت مندی کی وجاہت کا خیال، تمہیں انصاف سے روک دے۔ اس باب میں تم اپنے کسی

[1] The Theory of Good and Evil, Vol. II, P311

جذبے کی پروا مت کرو۔ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (4/135) ایسا بھی نہ ہو کہ تم شہادت دیتے وقت کوئی گول مول یا پیچدار بات کہو یا ویسے ہی ٹال جاؤ۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔''

آپ دیکھئے کہ یہاں حیوانی اور انسانی اقدار میں کس طرح (Tie) پڑتی ہے۔ عدل کی پاسبانی اور اس کے لیے سچی شہادت مستقل اقدار میں سے ہیں۔ اس کے برعکس، مفاد خویش، اعزاء واقرباء کے تعلقات کا خیال، فریق مخالف کی دولت اور وجاہت کے اثرات کا تصور، قدم قدم پر عناں گیر ہو رہا ہے کہا گر سچی گواہی دی تو یہ نقصان ہوگا۔ وہ ضرر پہنچے گا۔ لیکن ان تمام نقصانات کا تعلق انسان کی طبعی زندگی سے ہے۔ اس کش مکش میں جو شخص ان طبعی تقاضوں کو ترجیح دے کر جھوٹی شہادت دیتا ہے یا شہادت دینے سے پہلو تہی کرتا ہے۔ اس کا کیریکٹر پست ہے۔ (قرآن اسے اتباع ہویٰ سے تعبیر کرتا ہے) ہویٰ کے بنیادی معنوں میں پستی کی طرف لے جانے کا مفہوم ہے) لیکن جو شخص ان تمام امیال وعواطف کو نظر انداز کر کے حق کی گواہی دیتا ہے وہ بلند کردار کا حامل ہے۔ حیوانی جذبات اور انسانی اقدار کی یہ جنگ زندگی کے ہر دوراہے پر ہوتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ ان دوراہوں پر آپ کا قدم کس طرف اٹھتا ہے۔

اس مقام پر یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ انسان اپنے طبعی (حیوانی) تقاضے کو قربان کر کے انسانی اقدار کی حفاظت کیوں کرے؟ طبعی تقاضوں میں بڑی کشش وجاذبیت ہوتی ہے۔ دولت، ثروت، عیش وآرام کی زندگی۔ عزت اور نام کی شہرت۔ بلند مناصب ومدارج، قوت اقتدار، حکومت۔ ان سب میں بڑی جاذبیت ہے۔ ان کے مقابلہ میں انسانی اقدار کے تحفظ میں کونسی لذت یا منفعت ہے۔ جس کی خاطر انسان ان تمام مفاد ومنافع اور لذات وحظاظ کو قربان کر دے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور جب تک اس کا اطمینان بخش جواب سامنے نہ آئے انسان اس قدر منافع ولذات کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوسکتا۔ آج دنیا میں جو اس قدر کیریکٹر کا فقدان نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو اس سوال کا اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ انسان مفاد پرست واقع ہوا ہے۔ ذاتی مفاد کا خیال اس کے دل سے نکالا نہیں جاسکتا۔ (مفاد خویش کا

تحفظ درحقیقت جذبہ تحفظِ خویش ہی کی شاخ ہے) وہ مفاد خویش کی خاطر انسانی اقدار کی اس لیے پروا نہیں کرتا کہ اسے ان اقدار کی نگہبانی میں اپنا کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اسے اس امر کا یقین ہوجائے کہ انسانی اقدار کا تحفظ، حیوانی تقاضوں کی تسکین کے مقابلے میں زیادہ منفعت بخش ہے تو وہ یقیناً ان اقدار کے تحفظ کے لیے وہ سب کچھ کر گزرے گا جو وہ آج اپنے حیوانی مفاد کے تحفظ کے لیے کرتا ہے۔۔۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔۔۔ اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھیے۔

ایک شخص کئی دنوں کا بھوکا ہے۔ اتنا بھوکا کہ نقاہت کی وجہ سے اس سے اٹھا تک نہیں جاتا۔ اتنے میں ایک آدمی، گرم گرم پلاؤ کا قاب اس کے سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس قاب پر جھپٹ پڑے گا۔ وہ جلدی سے لقمہ اٹھاتا ہے اور اسے منہ کے قریب لے جاتا ہے کہ دوسرا شخص اس سے کہتا ہے کہ اس پلاؤ میں اور تو ہر چیز نہایت عمدہ اور خالص ہے لیکن غلطی سے اس میں نمک کی جگہ سنکھیا پڑ گیا ہے۔

آپ کیا کیا خیال ہے کہ یہ سننے کے بعد وہ اس لقمہ کو منہ میں ڈال لے گا یا قاب اٹھا کر باہر پھینک دے گا؟ وہ یقیناً قاب اٹھا کر پھینک دے گا، وہ اس پلاؤ کو ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ اسے یقین ہے کہ اس کے کھانے سے اس کی موت واقع ہوجائے گی۔ وہ بھوک کی تکلیف اور زندگی کے زیاں کا مقابلہ کرے گا اور اپنا فائدہ اسی میں دیکھے گا کہ بھوک کی تکلیف برداشت کر لے لیکن اپنی جان ضائع نہ کرے۔

اب اسی مثال میں اتنی سی تبدیلی کر لیجیے کہ جب اس نے پلاؤ کا لقمہ اٹھایا تو دوسرے شخص نے کہا کہ بھئی! یہ پلاؤ ویسے تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ہے حرام کی کمائی کا۔ اب سوچیے کہ وہ شخص اس لقمہ کو منہ میں ڈال لے گا یا قاب اٹھا کر باہر پھینک دے گا؟ وہ پلاؤ ضرور کھالے گا اور اس بات کی ہزار تاویلیں کر لے گا کہ وہ ناجائز کمائی کا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ اسے پلاؤ کھا لینے میں تو اپنا فائدہ نظر آتا ہے لیکن اسے چھوڑ دینے میں کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اسے یقین ہوتا کہ اس پلاؤ کے کھانے سے بھی اس کی ہلاکت ہوجائے گی تو وہ اسے اسی طرح اٹھا کر پھینک دیتا جس طرح اس نے سنکھیا والے پلاؤ کو اٹھا کر پھینک دیا تھا۔

سوال سارا یہ ہے کہ جب جسم کے کسی تقاضے اور انسانی قدر میں تصادم ہوجائے، اگر اس وقت انسان کو یہ یقین ہو کہ اس قدر کی حفاظت میں اس کا زیادہ فائدہ ہے تو وہ یقیناً اس کے تحفظ کے لیے جسم کے تقاضے کو قربان کردے گا۔ آیئے دیکھیں کہ اس مقصد کے لیے عام طور پر کیا کہا جاتا ہے اور قرآن اس اہم گتھی کو کس طرح سلجھاتا ہے۔ اخلاقیات کا سارا راز اسی میں ہے۔

مذہب پرست طبقہ کی طرف سے جواب

جن لوگوں کے نزدیک انسانی اقدار اپنا وجود ہی نہیں رکھتیں، سردست انہیں چھوڑیئے اور ان کی طرف آیئے جو ان اقدار کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان میں ایک طبقہ وہ ہے جسے عام طور پر ''مذہب پرست'' یا خدا پرست کہا جاتا ہے۔ (اسلام دین ہے مذہب نہیں، اس لیے اسلام کا شمار مذاہب میں نہیں ہوتا لیکن اسے اب مذہب ہی سمجھا جاتا ہے) ان کی طرف سے اس سوال کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جن امور کو انسانی اقدار کہا جاتا ہے وہ خدا کے احکام ہیں۔ ان کی اطاعت سے خدا خوش ہوجاتا ہے اور اگر اس کے احکام کو نہ مانا جائے تو وہ ناراض ہوجاتا ہے او رمرنے کے بعد جہنم میں ڈال دیتا ہے۔ لہٰذا انسان کو خدا کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہنا چاہیے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے۔

ظاہر ہے کہ اس انداز کے جواب سے انسان اس زمانے میں تو مطمئن ہوسکتا تھا، جب اس کا ذہن ہنوز عہد طفولیت میں تھا، لیکن اب یہ جواب اس کے لیے وجہ طمانیت نہیں ہوسکتا۔ آپ ایک بچے سے تو ڈرا دھمکا کر اپنا حکم منوا سکتے ہیں بڑے آدمی سے نہیں منوا سکتے۔ بڑا آدمی اگر بعض حالات میں اس کے لیے آمادہ ہو بھی جائے تو بھی اس کا دل اس کے خلاف بغاوت کرتا رہے گا اور اس موقع کی تلاش میں رہے گا کہ وہ ڈر کے بندھنوں کو توڑ کر آزاد ہوجائے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جو بات محض کسی کے ڈر سے کی جائے اس میں کیریکٹر کی بلندی کا کیا سوال؟ اگر کوئی شخص گرفتاری کے ڈر سے چوری نہیں کرتا تو اسے صاحب کردار نہیں کہا جائے گا۔ لہٰذا مذہب پرست طبقہ کا یہ جواب، اس مقصد کے حصول کے لیے اطمینان بخش ثابت نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل مذہب کی گرفت دلوں پر سے ڈھیلی پڑ رہی ہے۔

مفکرین کا طبقہ

دوسرا طبقہ مفکرین کا ہے۔ اس باب میں ان کا کیا خیال ہے، اس کے متعلق بہت سے مفکرین مغرب کے اقوال پیش کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس سے بات لمبی ہوجائے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم اس ضمن میں ایک آدھ مفکر کا نظریہ پیش کردیں تو مقصد پیش نظر کے لیے وہی کافی ہوگا۔ مغربی مفکرین میں جو مقام کانٹ کو حاصل ہے وہ ارباب فکر سے پوشیدہ نہیں۔۔۔ کانٹ کے نزدیک اخلاقیات کی ساری عمارت انسان کے نیک ارادے (Good will) کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے وہ کہتا ہے کہ:

اس دنیا میں بلکہ اس سے باہر بھی کوئی چیز ایسی نہیں جسے بلا مشروط خیر محض کہا جاسکے، سوائے نیک ارادے کے۔

اور نیک ارادے کی تعریف (Definition) کانٹ کے نزدیک یہ ہے کہ:

وہ ارادہ جو کسی کام کو محض اس لیے کرتا ہے کہ اس کا کرنا فرض (Duty) ہے۔

یعنی ہر قسم کے افادی تصور سے بے نیاز ہوکر فرض کو محض فرض سمجھ لینا، کرنا، نیک ارادہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس عمل میں (خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو) ذرہ بھر بھی صلہ کی اُمید یا معاوضہ کا تصور شامل ہوجائے وہ عمل، عمل خیر نہیں رہتا۔ اس کے نزدیک عمل خیر کی قیمت وہ اصول ہوتا ہے جس کے مطابق وہ عمل میں آتا ہے۔ اس نظریہ کے تحت کانٹ کے نزدیک۔ اصول بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو انسان کو کسی مقصد کے حصول کے لیے آمادہ عمل کریں۔ انہیں کانٹ مادی اصول (Material Maxims) قرار دیتا ہے اور دوسرے وہ جو کسی مقصد کے تصور کے بغیر آمادہ عمل کریں۔ ان کا نام، ان کی اصطلاح میں (A Priori Maxims) ہے۔ اس کے نزدیک یہ اصول انسان کے اندر، فرض (Duty) کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اس قسم کے اصول کو وہ امر غیر مشروط (Imperative Categorical) کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

امر غیر مشروط سے مفہوم یہ ہے کہ اس سے ایسا کام ظہور میں آئے جس سے کسی مقصد کا

حصول مقصود نہ ہو، بلکہ وہ کام اپنی ذات میں واجب العمل ہو۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اسے اگر عام فہم الفاظ میں بیان کیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ انسانی اقدار انسان کے فرائض ہیں۔ انہیں انسان کو فریضہ سمجھ کر ادا کرنا چاہیے۔ نہ کہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ۔ ان کے ''فرائض'' ہونے کے لیے نہ کوئی دلیل دی جاسکتی ہے۔ (A Priori) کے یہی معنی ہیں۔ اور نہ ہی ان فرائض کی سرانجام دہی سے کسی صلہ یا معاوضہ کی توقع رکھنی چاہئے۔

ظاہر ہے کہ یہ نظریہ فکری طور پر کتنا ہی بلند آہنگ اور خوش آئند کیوں نہ ہو، انسان کے دل میں ایسا جذبہ نہیں ابھار سکتا جس سے وہ مادی مفاد اور طبعی لذات کو قربان کر کے۔ انسانی اقدار کے تحفظ کے لیے آمادہ عمل ہو جائے۔ اس کے لیے کسی بہت بڑے جذبہ محرکہ کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ انسان ''مفاد خویش'' کے خیال سے کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ یہ (ذہنی اور قلبی طور پر مطمئن ہوکر) کوئی ایسا کام نہیں کرسکتا۔ جس میں اسے اپنا فائدہ نظر نہ آئے۔ یہ وجہ ہے کہ دنیا میں نہ فلاسفرز کے بلند آہنگ نظریات اور نہ تارک الدنیا ارباب تصوّف کے کیف آور پند و نصائح انسانوں کو ''مفاد خویش'' سے بے نیاز کر کے مستقل اقدار کے محافظ بنا سکنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی کامیابی زیادہ سے زیادہ چند افراد تک محدود رہی ہے۔ زندگی کا مسلک نہیں بن سکی۔ ان میں زندگی کا عالمگیر مسلک بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ زندگی کا عالمگیر نظریہ اور مسلک بننے کی صلاحیت صرف اس اصول میں ہے جسے قرآن کریم نے پیش کیا ہے۔ دیکھئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتا ہے۔

قرآن کی رو سے زندگی کے دو نظریے

قرآن کہتا ہے کہ زندگی کے متعلق دو نظریے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان حیوانات ہی کی بڑھی ہوئی شکل ہے۔ اس کی زندگی بس طبعی زندگی ہے۔ یہ طبعی قوانین کے ماتحت زندہ رہتا ہے اور انہی قوانین کے تابع ایک دن اس کے جسم کی مشینری چلتے چلتے بند ہو جاتی ہے، اسے موت کہتے ہیں اور موت کے ساتھ اس فرد کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصور زندگی کے مطابق انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہتا اور انسان کے سب تقاضے حیوانی سطح زندگی

کے تقاضے رہ جاتے ہیں۔ اس میں انسانی اقدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ انسانوں کو مل جل کر رہنا ہے اور اس طرح رہنے سے ان کے حیوانی تقاضوں کی تسکین میں ایک دوسرے سے تصادم ہو جاتا ہے۔ اس لیے سوسائٹی ایسے قوانین وضوابط مرتب کرتی ہے جو اس کے تابع رہتا ہے اسے پر امن شہری کہا جاتا ہے جو ان کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ عدالت میں سزا پاتا ہے یا سوسائٹی کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصور حیات کی رو سے۔

(i) سوسائٹی کے پاس کوئی مستقل اقدار یا اصول نہیں ہوتے۔ وہ جس قسم کے قوانین وضوابط مناسب سمجھے وضع کر لے اور جب چاہے ان میں تغیر وتبدل یا حک واضافہ کر لے۔

(ii) ان قوانین وضوابط کے اتباع کے لیے جذبہ محرکہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کی خلاف ورزی سے عدالت سے سزا مل جائے گی یا انسان سوسائٹی کی نظروں سے گر جائے گا۔ لہٰذا:

(iii) اگر کوئی شخص ایسا انتظام کر لے کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کر لے لیکن عدالت کی گرفت میں نہ آئے یا سوسائٹی اس کا محاسبہ نہ کرے تو پھر اسے ان قوانین کی پابندی کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔

(iv) اس سوسائٹی میں کیریکٹر کی بلندی کا معیار صرف ایک ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انسان ذاتی مفاد کو قوم اور ملک کے مفاد پر ترجیح نہ دے۔ ان کے ہاں قوم فروشی، قانونی جرم بھی ہوتا ہے اور سوسائٹی کی نظروں میں معیوب بھی۔ لیکن اگر کسی ملک میں قانونی نظام کمزور ہو جائے اور مفاد خویش کا جذبہ ایسا عام ہو جائے کہ سارے کا سارا ملک اس رو میں بہہ نکلے تو پھر نہ کوئی قوت ایسی رہتی ہے جو افراد قوم کو اس لوٹ کھسوٹ سے باز رکھ سکے اور نہ کوئی جذبہ محرکہ ایسا جو ان کے اندر کیریکٹر کے احساس کو بیدار کر سکے۔ اس وقت دنیا جس جہنم میں سے گزر رہی ہے اس کی وجہ، زندگی کا یہی تصور ہے۔ اسے سیکولر نظریہ حیات کہا جاتا ہے۔ جن قوموں میں قومی مفاد کا شعور بیدار ہے وہ اپنی قوم سے باہر کے انسانوں کے لیے عذاب بن رہی ہیں۔ اور جن میں یہ شعور بھی باقی نہیں رہا وہ ایسے جذام میں مبتلا ہیں جس سے وہ اپنے آپ سے بھی نالاں ہیں اور ساری دنیا بھی اس سے نفرت کرتی ہے۔

کیریکٹر کی اس تعریف (Definition) کی رو سے، جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اس تصورِ حیات کے مطابق کسی شخص میں کیریکٹر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں ہر انسان (یا انسانوں کا گروہ) اپنے طبعی مفاد کو سامنے رکھتا ہے۔ جب دو (طبعی) مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہو تو وہ دونوں میں موازنہ کرتا ہے اور زیادہ فائدے کو تھوڑے فائدے پر ترجیح دیتا ہے۔ اسے آپ منفعت اندیشی کہیں گے۔ کیریکٹر نہیں کہیں گے۔ حتیٰ کہ اس تصور کے ماتحت اگر کوئی شخص قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیتا ہے تو وہ بھی اپنے ایک زیادہ قیمتی طبعی تقاضے کو کم قیمتی طبعی تقاضے پر ترجیح دیتا ہے۔ (تفصیل اس کی آگے چل کر پیش کی جائے گی۔)

دوسرا تصورِ حیات

یہ تھا ایک تصورِ زندگی اور اس کے نتائج و عواقب۔ قرآن کی رو سے دوسرا تصورِ زندگی یہ ہے کہ انسان اس کے جسم ہی سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات (Human Personality) یا نفس کہتے ہیں۔ انسانی زندگی کا مقصد اس کی ذات کی نشوونما ہے۔ چونکہ اس کی نشوونما کے لیے جسم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ ساتھ جسمانی نشوونما بھی ضروری ہے۔ لیکن جسمانی نشوونما، ذات کی نشوونما کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔ مقصود بالذات انسانی ذات کی نشوونما ہی ہے۔

آپ کسی انسان کے دل کو ٹٹولئے اور دیکھیے کہ اس کی عمیق ترین آرزو اور شدید ترین تمنا کیا ہے؟ آپ دیکھیں گے کہ انسان کی سب سے زبردست خواہش یہ ہے کہ وہ زندہ رہے۔ کوئی انسان مرنا نہیں چاہتا۔ تحفظِ خویش اس کی جبلت کا تقاضا ہے اور اس کی عقل وہ تمام سامان وذرائع بہم پہنچاتی ہے جس سے اس کا یہ مقصد پورا ہوتا رہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے قرآن نے قصہ آدم کے تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ابلیس نے انسان کے اس کمزور پہلو کو بھانپا۔ وہ اس کے پاس گیا اور نہایت مشفقانہ انداز میں کہا کہ کیا تمہیں ایک ایسا نسخہ بتاؤں جس سے تمہیں حیاتِ جاوید حاصل ہو جائے اور ایسا اقتدار مل جائے جسے کبھی زوال نہ ہو؟ یہ

آدم (آدمی) کے دل کی خواہش تھی۔ وہ لپک کر آگے بڑھا اور ابلیس سے کہا کہ مجھے ضرور ایسا نسخہ بتاؤ۔ ابلیس نے کہا کہ تم اپنے مرنے کے بعد اپنی اولاد کے ذریعہ زندہ رہ سکتے ہو۔ اس سے تمہارے نام کو حیات دوام حاصل ہوسکتی ہے۔ ابلیس کا یہ افسوں کس درجہ کارگر ہوا، اس کا ثبوت روزمرہ کی زندگی میں قدم قدم پر مل سکتا ہے۔ جس عمر رسیدہ آدمی کے ہاں اولاد (بالخصوص نرینہ اولاد) نہیں ہوتی، دیکھیے کہ وہ بیٹے کی پیدائش کے لیے کس قدر تڑپتا ہے۔ وہ ہر سانس میں کہتا ہے کہ اگر میں اسی طرح مرگیا تو میرے گھر کا چراغ گل ہوجائے گا۔ میرا نام ونشان مٹ جائے گا۔ میرے نسب کا شجرہ منقطع ہوجائے گا۔ میرے خاندان کی جڑ کٹ جائے گی۔

لیکن خدا نے انسان سے کہا کہ یہ ابلیس کا فریب ہے۔ یہ مادی تصور حیات کا افسوں ہے۔ باپ کی زندگی اپنی ہے۔ اولاد کی اپنی، اولاد کے زندہ رہنے سے باپ کو حیات جاوید نہیں مل سکتی۔ حیات جاوید حاصل ہونے کا طریقہ کچھ اور ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر انسانی ذات کی مناسب نشوونما ہوجائے تو انسان کی طبعی موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔۔۔ انسان کو حیات جاوید، انسانی ذات کی نشوونما سے مل سکتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

زندگانی ہے صدف، قطرہ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہواگر خود نگر و خودگر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مرنہ سکے

پھر قرآن نے یہ بھی بتادیا کہ زندگی کی موجودہ سطح پر ذات کی نشوونما، جسم کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اس لیے انسانی جسم کا تحفظ اور اس کے تقاضوں کی تسکین بھی ضروری ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے انڈے میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ اگر اس کی مناسب نشوونما ہوجائے تو اس کے اندر مضمر حیات، ایک جیتے جاگتے چوزے کی شکل اختیار کرلے لیکن اس کے لیے انڈے کے خول کا محفوظ اور مضبوط ہونا ضروری ہے۔ لیکن انڈے کا خول بہرحال انڈے کی امکانی صلاحیتوں کے برومند ہونے کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔ جونہی وہ مقصد حاصل ہوجاتا

ہے۔یعنی بچہ بن جاتا ہے۔خول کی ضرورت نہیں رہتی۔وہ ٹوٹ کر الگ ہوجاتا ہے اور اس کے اس طرح ٹوٹ جانے سے بچہ کا کچھ نہیں بگڑتا۔اسی طرح انسانی جسم، اس کی ذات کی نشوونما کا ذریعہ ہے۔مقصود بالذات نہیں۔ذات کی نشوونما کے بعد اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

اس نے یہ بھی بتادیا کہ جس طرح انسانی جسم کی نشوونما کے لیے طبعی قوانین مقرر ہیں۔اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لیے بھی کچھ قوانین ہیں۔ان قوانین کو انسانی اقدار یا مستقل اقدار (Permanent Values) کہتے ہیں۔یہ اقدار وحی کے ذریعہ ملتی ہے اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔جس طرح جسم کی پرورش کے قوانین عالمگیر ہیں اسی طرح یہ مستقل اقدار بھی عالمگیر ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ دیکھئے کہ جو شخص اس تصور حیات پر ایمان رکھتا ہے اس کی زندگی (اور زاویہ نگاہ) میں اور اس شخص کی زندگی (اور زاویہ نگاہ) میں جو سیکولر تصور حیات رکھتا ہے، کتنا وسیع اور گہرا فرق پیدا ہوجاتا ہے۔مثلاً:

(i) سیکولر تصور حیات کی رو سے انسان کی طبعی زندگی اور تقاضے مقصود بالذات ہوتے ہیں، اس لیے اس کے سامنے نہ طبعی تقاضوں سے بلند کوئی اور تقاضا ہوتا ہے اور نہ ہی طبعی قوانین سے بالاتر کوئی قوانین اور اقدار، لیکن

(ii) قرآنی تصور حیات کی رو سے، انسانی جسم اور اس کے تقاضے، مقصود بالذات نہیں ہوتے۔ایک بلند مقصد (استحکام ذات) کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں۔اور دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

(iii) قرآنی تصور حیات کی رو سے جسم کے تقاضوں کی تسکین بھی ضروری ہوتی ہے۔لیکن جب کبھی جسم کے کسی تقاضے اور اس کی ذات کے تقاضے (یا طبعی تقاضہ یا مستقل اقدار کے تقاضہ) میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو وہ ذات کے تحفظ کے لیے جسمانی تقاضے کو قربان کردیتا ہے۔اس لیے کہ کوئی صاحب عقل وہوش ذریعے کو بچانے کے لیے مقصد کو قربان نہیں کرتا۔جب اس شخص نے سنکھیا والے پلاؤ کو پھینک دیا تھا تو ہر چند عام حالات میں کہ پلاؤ، اس کی جان بچانے کا

ذریعہ تھا۔ لیکن جب وہ ذریعہ اس کی جان کی ہلاکت کا موجب بن گیا تو اس نے جان کی خاطر ذریعہ کو چھوڑ دیا۔

(iv) قرآن کے تصورِ حیات پر ایمان رکھنے والا، مستقل اقدار کی حفاظت، کسی کا حکم یا فریضہ سمجھ کر نہیں کرتا۔ وہ اس میں اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ وہ طبعی تقاضہ اور مستقل اقدار کے ٹکراؤ کے وقت، دونوں میں موازنہ کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ان میں سے کس کے تحفظ میں اس کا زیادہ فائدہ ہے۔ وہ طبعی تقاضا کے تحفظ میں طبعی (لہٰذا عارضی) حیات کا فائدہ دیکھتا ہے اور مستقل قدر کے تحفظ میں، انسانی (لہٰذا دائمی) حیات کا فائدہ۔ لہٰذا خود اس کی عقل کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ فائدہ کی خاطر کم فائدہ کو قربان کر دے۔ اقبالؒ صرف طبعی تقاضوں کا تحفظ کرنے والی عقل کو ''عقل خود بیں'' اور طبعی اور انسانی ذات دونوں کے تقاضوں کا تحفظ کرنے اور ان میں موازنہ کرنے والی عقل کو ''عقل جہاں بین'' کہہ کر پکارتا ہے۔ قرآن، طبعی تقاضوں کو قریبی زندگی (حیوٰۃ الدنیا) کے مفاد اور انسانی ذات کے تقاضوں کو مستقبل (آخرت) کے مفاد سے تعبیر کرتا ہے اور مومنین کو اولوالالباب کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی بلند سطح کی عقل کے حامل انسان۔

(v) اس سے ظاہر ہے کہ مستقل اقدار کا تحفظ، خود انسان کی عقل کا تقاضہ ہو جاتا ہے۔ انسانی عقل ہمیشہ مفاد خویش چاہتی ہے۔ جب وہ دو مفادات میں موازنہ کرتی ہے تو وہ بڑے فائدے کی خاطر چھوٹے فائدے کو چھوڑ دیتی ہے۔ حیوانی سطح زندگی پر انسان کی عقل کا درجہ پست ہوتا ہے۔ انسانی سطح (یعنی مومن کی سطح) پر اس کا درجہ بلند ہو جاتا ہے۔ مومن کی عقل، بلند سطح کی عقل ہوتی ہے۔ (vi) جو کام عقل خود بیں کے تقاضے سے کیا جائے اسے (عام اصطلاح کے مطابق) عقل مندی کہا جائے گا۔ لیکن جو کام عقل جہاں بیں کے تقاضے سے کیا جائے اسے عقل مندی اور کردار دونوں کا مجموعہ قرار دیا جائے گا۔ مومن کے ہاں ایمان اور عقل میں قطعاً مغائرت نہیں ہوتی۔ چونکہ سیکولر نقطۂ نگاہ کی رو سے طبعی زندگی کے علاوہ کوئی زندگی نہیں ہوتی اس لیے ان کی زبان میں عقل خود بیں اور عقل جہاں بیں کے لیے الگ الگ الفاظ ہی نہیں تھے۔ اب ماہرین علم النفس بلکہ علم تجزیہ نفس (Psycho Analysts) نے دو الگ الگ

صطلاحات وضع کی ہیں۔ایک وہ عقل جو انسان کے طبعی تقاضوں کے حصول اور ان کی تائید میں دلائل فراہم کرے وہ اسے (Rationalising Intellect) سے تعبیر کرتے ہیں اور دوسری وہ عقل جو انسانی نفس کے حق میں دلائل فراہم کرتی ہیں وہ اسے (Reason) کہہ کر پکارتے ہیں۔اقبالؒ نے ان کے لیے پہلے ہی دو اصطلاحات وضع کر دی تھیں۔اوّل الذکر کے لیے ''دانش برہانی'' اور ثانی الذکر کے لیے ''دانش نورانی''۔

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ جب تک انسان اس تصور حیات پر ایمان نہ لائے (اس کی صداقت کا یقین نہ کرے) کہ:

ایمان کی ضرورت

(i) انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں۔جسم کے علاوہ انسانی ذات بھی ہے جس کی نشوونما مقصود زندگی ہے۔

(ii) ذات کی نشوونما کے لیے اسی طرح قوانین مقرر ہیں جس طرح جسم کی پرورش کے لیے۔ان قوانین کو مستقل اقدار کہتے ہیں۔

(iii) یہ مستقل اقدار خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتی ہیں اور

(iv) انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے۔

اس وقت تک اس کیریکٹر کا سوال ہی سامنے نہیں آتا جس کا تعلق عالمگیر شرف انسانیت سے ہے۔راشڈل لکھتا ہے کہ مستقل اقدار ماننے کے لیے۔

(1) سب سے پہلے یہ ماننا ضروری ہے کہ کائنات بلا مقصود نہیں پیدا کی گئی۔بلکہ اس کی تخلیق سے مقصد یہ ہے کہ یہ وہ سامان فراہم کرے جس سے انسانی ذات منزل مقصود تک جا پہنچے۔

(2) دوسرے یہ ماننا ضروری ہے کہ انسانی ذات

(ا) ایک مستقل حقیقت ہے۔

(ب) اس کی اپنی مستقل زندگی ہے۔یعنی مادی جسم کے تغیرات اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

(ج) یہ اپنے تمام افعال کی سبب آپ ہے۔

(3) تیسرے یہ ماننا ضروری ہے کہ انسان کے موجودہ عمل اس کے مستقبل کو متاثر کرتے ہیں۔ یعنی جس قسم کے اس کے اعمال ''آج'' ہوں گے اسی قسم کا اس کا ''کل'' ہوگا۔ بالفاظ دیگر اس کے لیے تسلسل حیات پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ جو شخص صرف موجودہ زندگی کا قائل ہے وہ پیش پا افتادہ مفاد کے پیچھے لگا رہے گا اور مستقل اقدار کو کچھ اہمیت نہیں دے گا۔ اس لیے کہ مستقل اقدار انسانی سیرت کی تعمیر کرتی ہیں اور سیرت کی تعمیر کی اہمیت اسی صورت میں سمجھ میں آسکتی ہے جب انسان، زندگی کو مستقل اور مسلسل سمجھے۔ ورنہ جو شخص یہ سمجھے کہ میری سانس کے ساتھ ہی میری سیرت کا خاتمہ ہوجائے گا اسے تعمیر سیرت کے لیے سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے۔

(4) اور سب سے ضروری یہ کہ خدا پر ایمان لانا ہوگا۔ اس لیے کہ اخلاقی آئیڈیل نفس (Mind) کے علاوہ اور کہیں موجود ہی نہیں ہوسکتا اور ایک مطلق اخلاقی آئیڈیل، نفس مطلق میں ہی موجود ہوسکتا ہے۔ جو ہر حقیقت کا سرچشمہ ہے۔ (ایضاً، ص:220-200)

آپ نے غور کیا کہ کیریکٹر کے لیے ایمان، کس قدر لاینفک شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہر جگہ'' عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ '' سے پہلے'' اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا '' کہتا ہے۔

اب آپ اس نکتہ کی طرف پھر آجایئے جسے ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ انسان ایسے کام کے لیے آمادہ نہیں ہوسکتا جس میں اسے اپنا فائدہ نظر نہ آئے۔ دو شخص دفتر میں کام کرتے ہیں۔۔۔ اس لیے کہ اس سے انہیں تنخواہ ملتی ہے۔ اس میں ان کا فائدہ ہے۔۔۔ ایک کاروباری آدمی کچھ خلاف قاعدہ مراعات حاصل کرنے کے لیے ایک اچھی خاصی رقم بطور رشوت پیش کرتا ہے۔ ان دونوں میں ایک شخص انسانی ذات پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ رشوت کی رقم فوراً قبول کرے گا۔ بشرطیکہ اسے اطمینان ہوجائے کہ وہ پولیس کی گرفت میں نہیں آئے گا۔ وہ رشوت اس لیے لے لے گا کہ اس میں اس کا مالی فائدہ ہے۔۔۔ وہ شخص جو انسانی ذات پر ایمان رکھتا ہے کبھی رشوت قبول نہیں کرے گا اس لیے کہ اسے دیانتدار رہنے میں فائدہ نظر آتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ رشوت لینے سے اسے طبعی فائدہ ہوگا، لیکن اس کی ذات کا نقصان ہوگا۔ دوسری طرف

رشوت نہ لینے سے اس کا طبعی نقصان تو ہوگا لیکن اس کی ذات کا فائدہ ہوگا۔ وہ طبعی فائدہ اور ذات کے فائدہ میں موازنہ کرے گا اور چونکہ اس کے نزدیک ذات کا فائدہ بہرحال و بہرکیف زیادہ گراں بہا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ زیادہ فائدے کے لیے کم فائدے کو ٹھکرا دے گا۔ آپ نے دیکھا کہ اس ایمان سے انسان کے ''مفاد خویش'' کے جذبہ کی تسکین بھی کسی طرح ہوجاتی ہے۔

مفاد اور مفاد میں فرق

اس وقت اس کا جذبہ محرکہ بھی مفاد خویش ہی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن وہ مفاد اور مفاد میں فرق کرتا ہے۔ وہ طبعی جسم کے فائدے کے مقابلے میں ذات کے فائدے کو زیادہ قیمتی سمجھتا ہے۔ اس لیے کم فائدے سے صرف نظر کرکے زیادہ فائدے کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اس لئے وہ رشوت کی پیش کش کو ٹھکرا دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ اس کام کو نہ تو اس لیے کرتا ہے کہ یہ کسی کا ''حکم'' ہے اس لیے اس کی تعمیل ضروری ہے۔ نہ اس لیے کہ ایسا کرنا اس کا فرض ہے۔ وہ اسے اس لیے کرتا ہے کہ ایسا کرنے میں اسے اپنا فائدہ نظر آتا ہے۔ اس میں ڈر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ لیکن وہ ڈر ہوتا ہے اپنی ذات کے نقصان کا۔۔۔ جس طرح زہر آلود پلاؤ کھانے والے کو ڈر ہوتا ہے اپنی جان کی تباہی کا۔۔۔ اسے قرآن کی رو سے مکافات عمل کہتے ہیں۔ یعنی ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہونا۔

آپ نے غور کیا کہ انسانی ذات پر ایمان انسان کو کس طرح ہر آن حسن عمل (کیریکٹر کے مظاہرہ) پر آمادہ کیے چلا جاتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ایک مرد مومن حسن عمل کسی صلہ یا معاوضہ کی خاطر نہیں کرتا تو اس سے یہی مقصود ہوتا ہے کہ وہ عمل کا صلہ یا معاوضہ، طبعی یا حیوانی پیمانوں میں نہیں مانگتا۔ اسے اس کا صلہ ذات کے پیمانوں کے مطابق ملتا ہے۔ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ ۙ (10:72) سے یہی مراد ہے۔ (اس کے معنی یہ نہیں کہ مستقل اقدار کے مطابق عمل کرنے سے طبعی مفاد ملتے ہی نہیں۔ ان اقدار کے مطابق نظام زندگی متشکل کرنے سے اس دنیا کے طبعی مفاد بھی بڑی عمدگی سے حاصل ہوتے ہیں اور انسانی ذات کی نشوونما بھی ہوتی چلی جاتی ہے۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً کا یہی مفہوم ہے۔

یعنی دنیاوی زندگی بھی خوشگوار اور اخروی زندگی بھی خوشگوار۔

عمل کوئی بھی ہو وہ بلا صلہ یا بلا معاوضہ کبھی نہیں رہتا۔ صرف معاوضہ اور معاوضہ میں فرق ہوتا ہے۔ مثلاً انسانی ذات کی نشوونما کے لیے ایک قانون (مستقل) قدر یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کی کمائی میں سے جس قدر زیادہ دوسروں کی پرورش کے لیے دیتا ہے اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ جو شخص انسانی ذات پر ایمان رکھتا ہے وہ پوری محنت سے کمائی کرتا ہے۔ لیکن اس میں سے صرف اتنا اپنے لیے رکھتا ہے جس سے اس کی طبعی ضروریات پوری ہوں اور فاضلہ کمائی دوسروں کی پرورش کے لیے عام کر دیتا ہے۔ (قرآن کریم نے انسانی ذات کی نشوونما کا یہ طریق بتایا ہے) ظاہر ہے کہ طبعی پیمانوں سے ماپئے تو اس میں اس شخص کا سراسر نقصان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اگر کسی شخص کو معلوم ہو کہ جو کچھ اس کی ضروریات سے زائد ہوگا وہ دوسروں کے پاس چلا جائے گا تو وہ اتنا کمائے گا ہی کیوں جو اس کی ضروریات سے زائد ہو۔ وہ تھوڑی سی محنت کر کے اپنی ضروریات کے مطابق کمائے گا اور پھر چین سے سوئے گا۔ ان لوگوں کی یہ دلیل بڑی معقول نظر آتی ہے اور اس کا اطمینان بخش جواب کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ یہی وہ مشکل ہے جو کمیونسٹ ممالک میں پیش آ رہی ہے۔

روس کی مشکل

اس سوال کا جواب صرف قرآنی تصور حیات کی رو سے مل سکتا ہے اور یہی ہے وہ مقام جہاں قرآنی نظام، دیگر نظام ہائے معیشت و معاشرت سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ قرآن نظام کی حامل، مومنین کی جماعت ہوتی ہے۔ یعنی ان لوگوں کی جماعت جو اس حقیقت پر اعلیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں کہ:

(i) انسانی ذات کی نشوونما مقصود حیات ہے اور

(ii) ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے کہ انسان پوری پوری محنت کرے اور اپنی ضروریات سے زائد جس قدر ہو اسے نوع انسان کی پرورش کے لیے عام کر دے۔

ان لوگوں کے دل میں اس کے لیے کس قدر تڑپ ہوتی ہے۔ ہم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

اسے ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ جو ماں اپنے دودھ سے بچے کی پرورش کرتی ہے اس کی انتہائی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ اس کے زیادہ سے زیادہ دودھ پیدا ہوتا کہ اس کا بچہ بھوکا نہ رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کا دودھ اس غذا سے بنتا ہے جو وہ اپنے جسم کی پرورش کے لیے کھاتی ہے۔

مومن ایسا کیوں کرتے ہیں؟

لیکن وہ کبھی نہیں چاہتی کہ یہ غذا اس کے بدن کا جزو بن جائے اور دودھ میں تبدیل نہ ہو۔ اس کے برعکس، اگر کبھی اس کے دودھ میں کمی واقع ہوجائے تو وہ ڈاکٹر سے مشورہ کرتی ہے کہ کس طرح اس کی غذا (زیادہ سے زیادہ حد تک) دودھ میں تبدیل ہوجائے۔ وہ یہ سب کچھ کیوں کرتی ہے؟ محض اس لیے کہ بچے کی حفاظت اور پرورش اس کی زندگی کا مقصد بن چکی ہوتی ہے۔ اس سے اس کے قلب کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ بعینہ یہی حالت ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کا ایمان یہ ہو کہ دوسروں کی پرورش سے ان کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ کماتے ہیں اور اس سے صرف اپنی ضروریات کے بقدر رکھ کر باقی سب دوسروں کی پرورش کے لیے عام کردیتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات وہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ (59:9) دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی میں گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ جس طرح مامتا کی ماری ماں خود بھوکی رہتی ہے لیکن اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کی فکر کرتی ہے۔ خود گیلے بستر پر سوتی ہے اور بچے کو خشک جگہ پر لٹاتی ہے۔ جس طرح اس کے دل میں اس وقت کسی معاوضہ یا صلہ کا خیال نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ لوگ بھی جن کی پرورش کا سامان بہم پہنچاتے ہیں ان سے کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاۗءً وَّلَا شُكُوْرًا (76/9) ہم تم سے نہ کسی معاوضہ کے خواہاں ہیں، نہ شکریہ تک کے متمنی۔ اس مثال میں فرق یہ ہے کہ ماں بچے کے لیے یہ کچھ اس جبلی تقاضے کے ماتحت کرتی ہے جو ہر حیوان کے اندر ودیعت کرکے رکھ دیا گیا ہے۔ ہر حیوانی ماں بھی وہی کچھ کرتی ہے جو انسانی ماں کرتی ہے۔ لیکن بندۂ مومن یہ کچھ عقل وفکر کی رو سے اور اپنے اختیار وارادہ سے کرتا ہے اور ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر قرآن اپنے اس نظام کی عمارت استوار کرتا ہے جس میں

کیریکٹر خود بخود بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ سب سے پہلے مملکت کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان فراہم کرے۔

عملی طریق

اس سے انسانی سیرت کی وہ تمام کمزوریاں رفع ہوجاتی ہیں جو احتیاج کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور جو کیریکٹر کی پستی کا موجب بنتی ہیں۔ دوسری طرف وہ ہر فرد معاشرہ کے دل میں اس ایمان کو راسخ کرتا ہے (وہ راسخ کیا کرتا ہے۔ معاشرہ مشتمل ہی ان افراد پر ہوتا ہے جو اس ایمان کے حامل ہوں) (وہ نظام بچوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کرتا ہے کہ ان کے دل میں شروع سے یہ تصور راسخ ہوتا چلا جائے) کہ وہ جس قدر محنت کر کے کمائیں گے اور جو کچھ ان کی ضروریات سے زائد ہوا سے دوسروں کی نشوونما کے لیے دے دیں گے۔ اسی قدر ان کی اپنی ذات کی نشوونما ہوگی۔ اس سے وہ تمام خرابیاں دور ہوجاتی ہیں جو دولت جمع کرنے کی ہوس یا افراط زر سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس نظام میں نہ فاضلہ دولت کسی کے پاس رہتی ہے نہ مفاد پرستی کے جذبات انسانی سیرت کو داغدار کرتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کمیونزم کے نظام کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ فاضلہ دولت (Surplus Money) افراد کے پاس نہیں رہنے دے گا اور اس طرح نظام سرمایہ داری کی لعنتوں کو ختم کر دے گا۔ لیکن کمیونزم کا نظام مادی تصور حیات پر مبنی ہے۔ اس لیے اس میں وہ جذبہ محرکہ پیدا نہیں ہوسکتا جس کی بنا پر انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اپنی ضروریات سے زائد سب کچھ دوسروں کی پرورش کے لیے بطیب خاطر دے دے۔

کمیونزم کی بنیادی کمزوری

یہی وہ بنیادی کمزوری ہے جس کی وجہ سے کمیونزم کا نظام نہ قائم رہ سکتا ہے، نہ آگے بڑھ سکتا۔ اسے صرف استبداد کے زور پر قائم رکھا جاسکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ استبداد کے ڈنڈے سے قائم کردہ نظام، زیادہ دنوں تک چل ہی نہیں سکتا۔ وہی نظام قائم رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے جو افراد معاشرہ کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ یہ چیز قرآن کے پیش کردہ تصور حیات کے علاوہ اور کہیں ممکن نہیں۔ کمیونزم جس تصور حیات کی تخلیق ہے اسے

قرآن (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) حیوانی سطح زندگی قرار دیتا ہے۔ جس میں کیریکٹر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس تصور حیات کی رو سے مادی مفاد سے بلند کوئی قدر نہیں ہوتی۔

نیشنلزم کا جذبہ

اس میں آپ زیادہ سے زیادہ نیشنلزم کا جذبہ ابھار ابھار کر، افراد معاشرہ کو انفرادی مفاد سے قومی مفاد کی طرف لے جاسکتے ہیں۔ لیکن چونکہ (مغربی نظریہ جمہوریت کی رو سے) نیشنلزم کی بنیاد قوموں کے باہمی جذبہ منافرت پر ہے اور ایک قوم جانتی ہے کہ اگر مجھ میں کمزوری آ گئی تو قومیں مجھے ہڑپ کر جائیں گی۔ اس لئے جس چیز کو نیشنلزم میں قومی کردار کہا جاتا ہے وہ بھی تحفظ خویش (Preservation of Salf) ہی کے جذبہ کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ کسی انسانی قدر کو حیوانی تقاضے پر ترجیح دینے کا نام نہیں ہوتا۔ اس میں ایک فرد کے بجائے، افراد کا مجموعہ اپنا تحفظ چاہتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ تحفظ چاہتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ تحفظ خویش اچھی چیز نہیں اور کسی قوم کو اپنے ملک کی حفاظت نہیں کرنا چاہیے۔ تحفظ خویش نہایت ضروری ہے او راپنے وطن کی حفاظت تحفظ خویش کے لیے لاینفک۔ جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تحفظ خویش کے لیے (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) کوشش کرتا ہے تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ کسی بلند کیریکٹر کا ثبوت دیتا ہے۔ اس کے متعلق یہ ہی کہنا چاہئے کہ وہ عقل مندی اور دانش اطواری کا ثبوت دیتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنا تحفظ نہیں چاہتا (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) اس کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کا کیریکٹر پست ہے۔ کہا یہ جائے گا کہ وہ بڑا احمق ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے اگر کوئی شخص کشتی میں بیٹھا ہوا، کشتی میں سوراخ کر رہا ہو تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں کیریکٹر کی کمی ہے۔ اس کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ وہ پاگل ہے۔ جو شخص وطن میں رہتے ہوئے اس وطن کی تخریب چاہتا ہے، اس کا شمار پاگلوں میں ہوگا۔ لہٰذا نیشنلزم میں اگر کوئی شخص وطن کے مفاد کو، مفاد خویش پر ترجیح دیتا ہے تو اسے نہایت سمجھدار اور ہوشمند کہا جائے گا۔ (جس طرح اگر کوئی شخص کشتی کا سوراخ بند کرنے کے لیے اپنا قیمتی رومال اس میں ٹھونس دے تو اسے عقلمند کہا جائے گا) صاحب کردار وہ ہوگا جو کسی

ڈوبتے کو بچانے کے لیے دریا میں کود جائے اور یہ چیز صرف بلند اور مستقل اقدار پر ایمان لانے سے پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض افراد ایسے بھی ملیں گے جنہیں بلند اقدار کا احساس وشعور بھی نہیں ہوگا لیکن اس کے باوجود وہ ڈوبتوں کو بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔لیکن ان کے نفسیاتی تجزیہ کے بعد یا تو یہ حقیقت سامنے آیے گی کہ وہ اس بلند قدر کا غیر شعوری طور پر احساس رکھتے تھے اور یا ان کا جذبہ محرکہ کچھ اور تھا۔صاحب کردار وہی ہے جو دو اقدار کا شعوری طور پر موازنہ کرے اور پھر بلند قدر کی حفاظت کے لیے اس سے پست درجہ کی قدر کو علیٰ وجہ البصیرت قربان کردے۔ یہ چیز قرآن کی بیان کردہ مستقل اقدار پر ایمان لانے سے ہی ہوسکتی ہے۔ یہ کمیونزم یا کسی اور کے بس کی بات نہیں۔قرآن پر ایمان رکھنے والے اگر اپنے ملک کی حفاظت کے لیے ذاتی مفاد کی پروانہیں کرتے تو اس لیے نہیں کہ ملک کے تحفظ سے ان کا اپنا تحفظ ہوجائے گا بلکہ اس لیے کہ وہ ملک کو ان بلند اقدار کے بروئے کار لانے اور دنیا میں عملاً نافذ کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

مرد مومن کا جذبہ تحفظ وطن

اور اس کا تحفظ اس لیے چاہتے ہیں کہ اس سے مستقل اقدار کا تحفظ ہوجاتا ہے۔اس لیے اگر وہ ملک کی حفاظت واستحکام کے لیے ذاتی مفاد کی پروانہیں کرتے تو ان کا یہ عمل بھی اپنے طبعی تقاضے پر مستقل اقدار کو ترجیح دینے کے لیے ہوتا ہے۔لہٰذا یہ ان کے کیریکٹر کی بلندی کی دلیل ہوتا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ ایک مادہ پرست کے جذبہ تحفظ وطن اور ایک مومن کے جذبہ تحفظ وطن میں کس قدر بنیادی فرق ہے۔ مادہ پرست کے نزدیک وطن مقصود بالذات ہوتا ہے کیونکہ اس میں اس کی اور اس کی اولاد کی حفاظت مضمر ہوتی ہے۔لیکن مرد مومن کے نزدیک وطن مقصود بالذات نہیں ہوتا ہے کیونکہ اس میں اس کی اور اس کی اولاد کی حفاظت مضمر ہوتی ہے۔لیکن مرد مومن کے نزدیک وطن مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک وہ مستقل اقدار کے تحفظ وتنفیذ کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے اس کا اور اس کی اولاد کا تحفظ بھی ہوجاتا ہے۔جس طرح قرآنی نظام میں انسانی ذات کے استحکام کے ساتھ ساتھ دنیاوی مفاد بھی حاصل

ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ جو شخص مستقل اقدار پر ایمان رکھتا ہے اس کے نزدیک مقصود زندگی ان اقدار کا تحفظ ہے۔ باقی سب کچھ اس بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ جب وہ ان ذرائع کے تحفظ واستحکام کی خاطر اپنے طبعی تقاضوں کو پورا کرتا ہے تو وہ درحقیقت ان مستقل اقدار کے تحفظ واستحکام کے لیے ہوتا ہے۔ اس طرح ایک مومن کے دنیاوی کام بھی دین کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مملکت پاکستان کے حصول کا مقصد یہی تھا کہ اس میں ایسا نظام زندگی قائم کیا جائے جس سے افراد معاشرہ کی ذات کی نشوونما ہو جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس مملکت کا حصول مقصود بالذات نہیں تھا۔ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اس سے اگر طبعی مفاد (سیاسی، معاشی وغیرہ مفادات) حاصل ہوتے تھے تو وہ اس نظام کا فطری نتیجہ تھے لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام انہی افراد کے ہاتھوں قائم ہوسکتا تھا جن کا زاویہ نگاہ قرآنی ہو۔ یعنی جو انسانی ذات اور اس کی نشوونما کو اپنی زندگی اور اس مملکت کا مقصود ومنتہی سمجھیں۔ مملکت کے اقتدار کا اس پارٹی یا اس پارٹی کے ہاتھ میں ہونے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس میں فیصلہ کن سوال یہ ہے کہ کیا مملکت کا اقتدار ان افراد کے ہاتھوں میں ہے جو قرآنی تصور حیات پر ایمان رکھتے ہیں اور اقدار خداوندی پر عمل پیرا ہونے کو زندگی کا مقصد! اگر ایسا نہیں تو حکومتوں کی تبدیلی اور پارٹیوں کے ردوبدل سے وہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہوسکے گا۔ جس کے لیے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔ یہی وہ حضرات ہوں گے جنہیں صاحب کردار (کیریکٹر والے لوگ) کہا جائے گا اور انہی کے برسر اقتدار آنے سے معاشرہ کی ہر قسم کی برائیوں کا خاتمہ ہوسکے گا۔ یہ چیز مناسب تعلیم وتربیت کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہمارے جو راہ نما برسر اقتدار آتے رہے ان میں سے قریب قریب ہر ایک کے ساتھ میری راہ رسم تھی۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ ہماری موجودہ قوم جیسی تیسی بھی ہے اس کے ذمے تو صرف یہ فریضہ عائد کیا جائے کہ اس خطہ زمین کو محفوظ رکھیں۔ لیکن آنے والی نسل کی تعلیم وتربیت اس انداز سے کی جائے کہ قرآنی تصور حیات ان کے رگ وپے میں سرایت کر جائے اور اس طرح وہ

ایک مثالی صاحب کردار قوم بن کر ابھرے۔ مجھ سے اتفاق تو ان سب نے کیا لیکن (افسوس کہ) عملی قدم کسی نے بھی نہ اٹھایا۔ ہار تھک کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ (محدود پیمانے پر ہی سہی) جو کچھ مجھ سے بن پڑے مجھے خود ہی کرنا چاہیے۔ چنانچہ آج سے دس بارہ سال قبل ایک ایسی درسگاہ کے قیام کا مقصد بنایا گیا جس میں یونیورسٹی کے نصاب کے ساتھ قرآنی تصورات کو پیوست کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے پہلا مرحلہ زمین حاصل کرنے کا تھا۔ زمینداروں سے اپنے طور پر زمین خریدنے کا پہلا معاملہ ہی فریب انگیز ثابت ہوا تو حکومت سے درخواست کی گئی کہ ہمیں قیمتاً زمین (Acquire) کر دے۔ اس کے لیے قریب چار لاکھ روپیہ حکومت کے خزانہ عامرہ میں جمع کرایا گیا۔ یہ اسکیم اپنے ابتدائی مرحلہ میں تھی کہ حکومت نے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو اپنی تحویل میں لے لینے کا فیصلہ کر دیا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ درسگاہ (کالج) کے بجائے قرآنک ریسرچ سنٹر قائم کر لیا جائے جس میں فارغ التحصیل طلباء کی تربیت اس نہج پر کی جائے۔ خدا خدا کر کے حکومت کے قواعد وضوابط کے مراحل طے ہوئے اور زمین کا قبضہ ملنے میں چند ماہ باقی تھے کہ (سابق چیف منسٹر پنجاب) نواب صادق حسین قریشی کو وہ رقبہ پسند آ گیا لیکن چونکہ قاعدے کی رو سے وہ اس زمین کو حاصل نہیں کر سکتے تھے، ہماری ساری اسکیم ہی منسوخ قرار دے دی گئی۔ ہم نے اس کے خلاف ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا۔ دو سال کی طویل مدت کے بعد (حال ہی میں) اس کا فیصلہ ہمارے حق میں ہو گیا لیکن قریشی صاحب نے اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کرنے کی اجازت کے لیے درخواست گزار دی ہے۔ ان سطور کی تسوید تک پوزیشن یہ ہے۔

اگر ہمیں یہ زمین مل گئی (اور چونکہ موجودہ حکومت نے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی اجازت کا اعلان کر دیا ہے) تو میں اپنی اسکیم کے مطابق درسگاہ قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر عمر کے اس آخری حصہ میں میری یہ آرزو پوری جائے تو میں بحضور رب العزت سجدہ ریز ہوں گا۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

(طلوعِ اسلام نومبر 1960ء، صفحہ: 17 تا 38)